جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

الحق یعلو ولا یعلی

آل انڈیا نظامہ کانفرنس

کا

خطبۂ صدارت

جس کو

صدر کانفرنس

حضرت عظیم البرکت حامی ملت مولانا الحاج شاہ عاشق الرسول محمد عبدالقدیر صاحب قادری [illegible]

نے

[illegible] کے عظیم الشان اجلاس منعقدہ بریڈلا ہال لاہور میں ارشاد فرمایا

المشتہر

خواجہ غلام نظام الدین قادری بدایونی کان اللہ لہ

([illegible])

در مطبع امیر الاقبال پریس بدایوں طبع شد

ملنے کا پتہ

مکتبہ قادریہ عالیہ بدایوں یوپی

پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

اللہ اکبر

شہریارِ دکن

زندہ باد

دولت آصفیہ

پائندہ باد

آمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ اکبر حامداً و مصلیاً و مسلماً اللہ اکبر

حضرات! علمائے کرام و صوفیائے عظام اور دیگر معزز حاضرین

مجالس کا عام قاعدہ ہو گیا ہے کہ ہر خطبہ صدارت کی ابتدا اظہارِ شکریہ سے کی جاتی ہے اور ہر صدر کا فرض ہے کہ ممبران کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس کو عزت صدارت عطا فرمائی گئی۔ بات یہ ہے کہ تمام دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً اجتماعات پر سادہ لوحی کا قبضہ ہے ورنہ افتخار صدارت کے ساتھ اگر اس ذمہ داری کا بھی احساس ہو جو کسی اہم کانفرنس کے صدر پر عائد ہوتی ہے تو جذبات شکر کے پہلو بہ پہلو قلب میں خیالات فکر بھی موجود ہوں۔

حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کی سپاس گزاری کے عوض اپنے خدائے قادر و مقتدر سے دعا مانگوں کہ وہ میری تائید فرمائے اور یہ اہم خدمت باحسن وجوہ انجام پائے۔ آمین یا رب العالمین۔

البتہ میں آپ حضرات کا شکر گزار ہوں اور معترف ہیں بلکہ سات کروڑ مسلمانانِ ہند کو اہلِ پنجاب کا عموماً اور اہالی لاہور کا خصوصاً اس لیے شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اسی خاص مسئلہ کی طرف توجہ فرمائی اور "**نظام کانفرنس**" کا انعقاد اپنے ذمہ لیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ کانفرنس دہلی میں منعقد ہوتی یا اس کے بعد لکھنؤ میں مگر

ایں سعادت بزور بازو نیست ٭ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

زندہ دلان پنجاب نے جہاں اور بہت سے قومی امور میں پیش قدمی فرمائی ہے وہاں **نظام کانفرنس** جیسے اہم اجتماع کی طرف اسلامی ہند کو دعوت عمل دینا بھی ان کے حصہ میں رہا جس پر وہ ہر طرح قابل صد مبارکباد ہیں۔ غرض ان کو تمام مسلمانانِ ہند کی جانب سے عموماً اور طبقہ علما اور جماعت صوفیہ کی طرف سے خصوصاً دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند نے اس اہم مسئلہ میں جس مجرمانہ سکوت سے کام لیا ہے وہ کسی طرح قابل معافی نہیں۔ وہ ریاست حیدرآباد فرخندہ بنیاد جس کے وجود سے ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ ریاست جو بلا امتیاز مذہب اور بلا تفریق نسل و قوم تقریباً دو سو برس سے تمام اہلِ ہند کی سرپرستی کرتی رہی ہے اور جس کے خزانے سے ہر ماہ ایک بہت بڑی

نکل کر تمام ہندوستان کے طول و عرض میں فیض کے دریا بہا رہی ہو۔ اس کے فرمان روا کے
متعلق عام طور پر متوحش افواہیں گرم تھیں۔ اخبارات کے بڑے بڑے کالم طرح طرح کی چہ میگوئیوں
سے پر نظر آتے تھے، نامہ نگار تحت سے تحت اطلاع روانہ کر رہے تھے۔ مگر افسوس ہو کہ اب سے پیشتر
کبھی ایسی منظم کوشش نہیں کی گئی جو ان عظیم الشان خطرات کا سدباب کر سکے جن کا ہر آنے والی ساعت
میں امکان تھا۔"

بعض لیڈروں، قومی با حضرات علماء و صوفیا کی بعض افراد نے جو کچھ فرمایا یا بعض مسلم اخبارات نے
جس قدر حمایت کی وہ اگرچہ بجائے خود ایک معقول تعداد میں لیے جا سکتے ہیں۔ مگر مسئلہ کی
اہمیت اور موقعہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ اُن کا وجود عدم کے مساوی ہو۔
چاہیے تو یہ تھا کہ مسلمان متفقہ طور پر ثابت کر دیتے کہ "اعلیٰحضرت شہریار دکن
خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ کے ساتھ ان کو وہ عقیدت ہے کہ اُن کے لیے ہماری جان و مال کی ضرورت
ہوئی تو ہم اپنے خون کے آخری قطرہ سے بھی دریغ نہ کریں گے"

کون کہہ سکتا ہو کہ "حضور ممدوح" کے احسانات اس کے متقاضی نہیں ہیں۔ آج مسلم
یونیورسٹی کا گلزار کس کے فیض و کرم کی آبیاری سے سرسبز ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور
دارالترجمہ نے آج یورپ کے علوم و فنون کو ہمارے وطن کے لیے آسان کر دیا ہو۔ بلکہ
یوں کہیے کہ اردو زبان کو جو صرف ہندوستان کے اکثر مسلمانوں کی زبان ہے، بلکہ اکثر ہندوستان
کی عام زبان ہے اس مرتبہ پر پہنچا دیا ہو کہ وہ بحیثیت علم و فن مغربی زبانوں سے مقابلہ کر سکتی
ہے علاوہ ان مساجد، مدارس، خانقاہوں، کا شمار کرنا بھی دشوار ہے جو
محض "حضور پرنور" کی نظر کیمیا اثر کی بدولت عالم کے لیے فیض رساں ہیں۔
بلکہ اس بحر مواج کی لہریں ہندوستان کے طول و عرض سے متجاوز ہو کر حجاز و عراق کو عبور
کر کے یورپ و افریقہ میں اپنا فیض پہونچا رہی ہیں۔"

سابق خلیفۃ المسلمین حضرت سلطان عبد المجید خاں کو ترکوں کے آزاد طبقے
نے جب تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کیا اور جب وہ سوئزرلینڈ میں نان شبینہ کے محتاج
تھے تو یہ فخر "حضور ظل سبحانی" ہی کو حاصل ہوا کہ بروقت ان کی امداد فرمائی۔ بہر حال اس سلسلہ
میں زیادہ سے زیادہ لکھا جا سکتا ہو۔ اور وہ بھی واقعات کے مقابلہ میں کم از کم ثابت ہوگا۔"
پس کیا ایسی صورت میں مسلمانوں کا یہ مجموعہ سکوت ایک بہت بڑا جرم نہیں؟ ۔ اور کیا ایک

زبردست منظم و مرتب مدافعتی کوشش کی ضرورت نہیں ہے؟ ہے۔ اور ضرور ہے!
افسوس ہے کہ ہندوستان میں "مشترکہ قومیت" کی روح ابھی تک نہیں پیدا ہوئی ہو
اور گزشتہ چند سالوں میں جو وطنیت کی ایک خفیف سی شعاع افق ہند پر نمودار ہوئی تھی
ایام بعض دور اندیش حضرات کی بدولت "صبح کاذب" کی روشنی ثابت ہوئی اور اس کے بعد جا بجا
اس کے آفتاب نا اہل نمودار ہو پھر شب تار ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے
تک اہل ملک کی بدبختی کی بدولت شریک حال ہو۔ بلکہ مستقبل قریب میں کوئی امید کی جھلک بھی
نظر نہیں آتی ورنہ یہ کہنا کہ جس طرح مسلمانان ہند کو موجودہ نازک صورت حال کا مقابلہ متفقہ
کوشش سے کرنا ہو یوں ہی اس کے دوش بدوش برادران وطن کو بھی مصروف کار ہونا
چاہیے اور یہ ان کا اخلاقی فرض تھا، اس لیے کہ سرکار عالی نے اگر ایک طرف مسلم مدارس اور
خانقاہوں کو مناسب اور ماہوار رقوم سے اعانت فرمائی ہو اسی طرح ہندوؤں کے منادر
اور پاٹ شالوں کو بھی بڑی بڑی امدادیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ ایسا اظہر من الشمس
واقعہ ہو کہ جس کا انکار متعصب سے متعصب ہندو جو فرقہ وارانہ اختلاف کا کیسا ہی حامی ہو کبھی
نہ کر سکے گا۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض برادران وطن نے نہایت محسن کش روش
اختیار کر رکھی ہے جو ہر طرح قابل افسوس ہو۔

کل کی بات ہے کہ جب مہاراجہ اندور پر کمیشن مقرر ہوا تھا تو صرف دو مسلمان حضرات
نے کس دل سے کام لیا تھا حالانکہ ایک ہونہار نوجوان مسٹر باؤلا کے قتل کے سبب سے بہت
ممکن تھا ہندو مسلم سوال پیدا ہو جاتا جس کی وجہ سے شاید مہاراجہ اندور کو موجودہ حالت سے اور
بھی زائد تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑتا

سب سے زیادہ افسوس اس امر کا ہو کہ برادران وطن کو شدت تعصب نے نتیجہ (انجام)
انجام پر نظر کرنے کا موقع نہ دیا۔

بفرض محال اگر ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کو کچھ بھی صدمہ پہنچا تو یہ سمجھ لیجیے
کار خیر کا کیا حشر ہوگا؟ اس کا اندازہ ایک ادنیٰ برہمن سے لیکر ایک اچھی عقل تک کر سکتا ہے۔
غالباً بلکہ یقیناً اس وقت ہندوؤں کو مسلمانوں سے زیادہ پریشانی و پشیمانی کا سامنا ہوگا۔
کیا ہندو حضرات مسلمانوں کو اجازت دیں گے کہ کشمیر و پٹیالہ کے فرقہ وارانہ معاملات
کی داد خواہی گورنمنٹ آف انڈیا سے کریں اور اگر ہندوؤں کے طرز عمل سے مجبور ہو کر

مسلمانوں نے ایسا کر دیا تو کیا مسلمان اس میں حق بجانب نہیں ہونگے اور کیا اس وقت ہندوؤں کے
پاس کوئی جواب ہوگا اب رہ گئی صرف پشیمانی تو وہ بیجا اور وقت کا ہوگا جس سے کچھ حاصل نہ ہو سکے گا گو
ہم بحیثیت محب وطن مسلمانوں کی شہرت پر سکینگے

آج ہندو احباب مصنف "حضرت عالمگیر" کی فرضی سختی سے اس قدر برافروختہ ہیں کہ وہ اکبر
و جہانگیر کے واقعی روایات کو بالکل بھول گئے ہیں۔ مگر زمانہ عالمگیر کے فرضی افسانہ کو بھلا دینگے
اور ہندوؤں کو اکبر و جہانگیر کے لئے رعایتیں ہونگی۔ واقعہ یہ ہے کہ سب نے ہندوؤں سے تعصب
کو بہت ہی سخت کر دیا ہو ورنہ وہ کس منہ سے کہتے ہیں کہ مسٹر کاس نظام، مسلمانوں کی بے جا
اعانت کرتے ہیں۔ جبکہ خود ہندوؤں کو بیش از بیش امداد مل رہی ہے۔ سچ ہے حبک الشی
یعمی و یصم۔

بعض افراد ایسے بھی ہیں اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی سرکار عالی سے
اسی قسم کی شکایت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم گورنمنٹ کی اس یک طرفہ پالیسی کے سمجھنے سے قاصر ہیں
کہ ایک طرف جب لارڈ ریڈنگ "مظلومین فلسطین" کے عربوں کی ہمدردی حاصل کرنا ہو تو مظلومین فلسطین کو
سفارشی خط بنام اعلیحضرت شہریار دکن دیا جائے جس پر حضور ممدوح ایک لاکھ روپیہ کی کثیر رقم
مسجد اقصیٰ کیلئے عطا فرمائیں۔ اور جب لارڈ ارون کو شہریار دکن کے خلاف کچھ کارروائی کرنا ہو
تو اس قسم کے امور قابل اعتراض ٹھہریں۔ بہرحال ہم اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتے اور
جب تک گورنمنٹ آف انڈیا اور سرکار عالی کے درمیان جو مراسلت ہوئی ہو سرکاری طور پر شائع
نہ ہو جائے کسی نکتہ چینی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بلکہ ایک وہ شخص جس کو سیاسیات ہند پر
غور کرنے کا موقع ملا ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ امور قرین بحث ہوتے ہیں اور حقیقی طور پر جو امور
گورنمنٹ کی عام پالیسی ہیں اور بالخصوص ریاست ہائے ہند کی بابت تغیرات کے باعث ہوتے
آئے ہیں وہ اور ہی کچھ ہیں۔ یورپ کی پالیسی کے تغیر و تبدل کا راز جس میں مضمر ہے وہ اس کا
استعمار ہے۔ مستعمرین تمام ایشیا پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اور طرح طرح سے اپنا مطلب
حاصل کر رہے ہیں کبھی صنعتی دستگیری کے پردہ میں، اور کبھی غیر متمدن اقوام کو متمدن بنانے کے بہانہ
سے اپنی حرص و آز کو پورا کرنے سوچتے ہیں لیکن یہ بہت ہی زیادتی ہوگی کہ اگر اول الذکر میں صرف یورپین
اقوام ہی کو موردِ الزام بنا لیا جائے ہمارے یہاں بھی ایسے لوگ ہیں جو دست غیر کے عوض فروخت
خوش نیش زیادہ کارآمد ہوگی۔ وہی قوم مستعمرانہ شکار ہوتی ہے جو اپنے آپ کو اس جال کے لئے

کر کے بے مال و پر جائے اور اپنی غلطی سے اپنی آزادی و استقلال کی قدر نہ کرے۔

حضرت اورنگزیب عالمگیر کے بعد ہندوستان کو کوئی ایسا حکمران نہ ملا جو اس عظیم السلطنت
ملک کی زمام حکومت کو سنبھال سکتا۔ اور ہمیشہ شخصی حکومتوں میں یہی حال رہا ہو کہ اگر مرنے والے
شاہ کا جانشین ویسا نہ ہوا تو ملک میں عام طور پر تباہی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں
بھی ایسا ہی ہوا۔ یورپین اقوام جو للچائی ہوئی نظروں سے ہندوستان کو دیکھ رہی تھیں۔ اب ان کو
دوڑنے والے کا موقع ملا اور تھوڑے عرصہ کے بعد انگلستان و فرانس کے ایجنٹوں نے اپنا کام بڑے
پیمانہ پر شروع کر دیا۔

اگرچہ انگریز ہندوستان میں ایک تاجر کی حیثیت سے آئے تھے۔ اور شاید کبھی ہندوستانی
کو یہ خیال بھی نہ گزرتا ہوگا کہ یہ تجارت پیشہ قوم کبھی ہم پر حکمرانی بھی کرے گی۔ لیکن ہندوستانیوں
کی شامت اعمال ہمیشہ ایک نادر شکل میں ظہور کرتی رہی ہو

باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہی تجارت پیشہ قوم اولاً ملک کی ٹھیکہ دار بنی۔ اور پھر بادشاہ
خود مختار ہو گئی۔ وتلک الایام نداولہا بین الناس؛

میں آپ کے سامنے برطانوی حکومت ہند کی تاریخ نہیں پیش کرونگا۔ مجھے تو مختصر طور پر یہ
دکھا دینا ہے کہ انگریزوں نے اپنے زمانہ حکومت میں دیسی ریاستوں کے ساتھ کیا کیا؟ اور شروع
سے آخر تک وہ کونسا نقطہ مشترک ہے جو کم و بیش ہر تغیر و تجدید معاہدہ کے وقت موجود تھا
جس کو ہم برٹش پالیسی کا عنصر غالب سمجھیں۔ ہر انسان تھوڑے غور کے بعد آسانی سے اس نتیجہ
پر پہنچ جائے گا کہ اگرچہ بظاہر اس تغیر و تبدل حال کے متفرق اسباب بتلائے گئے ہوں
لیکن ہر وقت ہر معاہدہ میں یورپین استعمار ظاہر و پنہاں اپنا کام کر رہا تھا۔

انگریزوں کے ابتدائی دور میں ملک بنگالہ کے معاہدات، اور آخر زمانہ میں اودھ کے
استقلال کی پامالی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی منصف شخص اظہار تاسف کئے بغیر رہ جائے
ہمارا مقصد اس وقت برٹش حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی نہیں ہے۔ اور یہ زبانی مباحث
نہ ہم کو کچھ مفید ہو سکتا ہے اور نہ حکومت برطانیہ کو مضرت رساں ہوگا۔ لہذا اس غیر ضروری
بحث میں طوالت کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن جس قدر کہا گیا اس سے چشم پوشی بھی گناہ
تھی۔ اور حق و انصاف کا خون کرنا تھا۔

اس وقت ہم تمام دیسی ریاستوں سے قطع نظر کر کے صرف امر حکومت حیدرآباد

ممکن ہے یہی ہو کہ سرکار عالی نے اس کو پسند فرمایا ہوگا کیونکہ اعلیحضرت آصفجاہ اول کے زمانہ میں علاقہ کرناٹک دکن کے زیر اثر تھا اور ممدوح نے اپنے حسن انتظام سے پیشتر اس صوبہ کی نگرانی فرمائی۔ اس معاہدہ سے کرناٹک کی حیثیت حکومت دکن کے مساوی ہوگئی۔

اس معاہدہ میں ایک شرط ایسی بھی ہے جس سے ہندوستانی رؤسا کا دل ہل سکتا تھا اور وہ یہ کہ اب انگریز ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل انداز نہ ہوں گے۔ یہ بات ہوتی تو بڑی بات ہوتی۔

بہرحال [illegible] میں آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں صاحب بادشاہ دکن نے صوبہ کرناٹک پر حملہ کیا لیکن سوئے اتفاق سے اس حملے میں کامیابی نہیں ہوئی اب اس کا تصفیہ کیونکر ہو چونکہ ۱۷۵۹ء کے معاہدہ کی رو سے اس وقت انگریزوں نے اپنی وفاداری قائم رکھی ہوگی اور نظام کے دشمن محمد علی خاں نواب کرناٹک کی امداد وہی ہوگی جو خود انگریزوں کا ساختہ پرداختہ تھا اور اگر ایسا ہوا تو وہ کوئی قوت محمد علی کے پاس تھی جس نے آصفجاہ کے وقت کے سیلاب کو رد کر دیا اور واپس ہونے پر مجبور کیا۔ اس شکست کے بعد حکومت نظام نے کمر جنگ کی تیاریاں بڑے پیمانہ پر شروع کر دیں تو پھر انگریزوں کی طرف سے منت کیا گیا یہ معاہدہ کے لئے پہنچ گئے اور بارہ نومبر ۱۷۶۶ء کو ایک معاہدہ ہوا لیکن اس معاہدہ کی غرض کرناٹک کا تحفظ تھا وہ بھی اس لئے کہ اس کا نواب انگریزوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا ہوا تھا۔ ہم تو یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ جس وقت منت کیا تو اس قضیہ میں دخل در معقولات فرما رہے تھے تو اس پیرس والے معاہدہ کی کیا شکل پابندی ہو رہی تھی کہ انگریز ریاستہائے ہند میں مداخلت نہ کریں گے۔

بہرحال دوسرا معاہدہ بھی اعلیحضرت نواب میر نظام علیخاں صاحب اور منت کنندگان کے درمیان ہوگیا۔ اس معاہدہ میں بھی نظام کے کمال محبت کا اعتراف ہے مگر لب و لہجہ میں وہ نیاز مندی نہیں جو مسٹر فورڈ کے زمانہ میں تھی مگر ایک حد تک لب و لہجہ مساویانہ ہوا اس معاہدہ کی خاص خاص باتیں یہ ہیں کہ راج مہندری و مصطفےٰ نگر وغیرہ وغیرہ بہت سے اضلاع حکومت انگریزوں کو دیدیے گئے اور ان کے معاوضہ میں نو لاکھ سالانہ انگریزوں نے دینا منظور کر لیا یہ معاوضہ کافی تھا یا ناکافی اس فیصلہ کے لئے ضرورت ہے کہ ان اضلاع کی فہرست مرتب کی جائے اور مداخل و مخارج کا نقشہ مرتب کیا جائے پھر زمین کی ایک سیاسی حیثیت بھی

اہمیت ہے اور محل وقوع کے تغیر سے کم و بیش ہوتی رہتی ہے پس یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس وقت سیاسی حیثیت سے اس پر قبضہ کرنے کی انگریزوں کو کیا ضرورت تھی یہ سب امور قابل غور ہیں مگر ہم نے اس تحریر میں شروع ہی سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے شبہ کا بہتر سے بہتر فائدہ انگریزوں کو دیا جائے لہذا تمام مباحث سے قطع نظر کر کے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ چونکہ طرفین اس معاوضہ پر راضی ہوگئے تھے تو سمجھ لیجئے کہ یہ معاوضہ صحیح ہوگا اور ہم نو لاکھ سالانہ کو ہی غنیمت سمجھتے اگر وہ زر معاوضہ برابر ملتا رہتا مگر افسوس ہے کہ وہ بھی بعد میں مسدود ہوگیا جس کا تذکرہ آئندہ آتا ہے۔ اس معاہدہ کی اور دو شرطیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل سمجھی جاتی ہیں ایک یہ کہ کمپنی کی فوج جو اضلاع مذکورہ میں رہے گی وہ بوقت ضرورت سرکار عالی کو مدد دے گی بشرطیکہ تین ماہ قبل حکام انگریزی کو امداد کا آرڈر دیدیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ریاستوں کو جو خطرات پیش آتے تھے وہ ایسے کہاں تھے جس کے متعلق تین ماہ پیشتر سے پیشینگوئی کی جا سکتی ہو اور قبل از قبل ہی درخواست اعانت روانہ کر دی جائے اس کے بالمقابل دوسری شرط یہ ہو کہ جب انگریزوں کو فوج کی ضرورت ہوگی تو نظام کی افواج بھی انگریزوں کی اعانت کریگی بہت سی باتیں اس عہدنامہ میں مرقوم ہیں مگر افسوس ہے کہ اس اعانت میں تین ماہ قبل کی درخواست کی پابندی عائد نہیں۔ یہ تفریق جس قدر روشن ہے اس کی بابت کسی ریمارک کی ضرورت نہیں ہے سب سے بڑی بات جو اس معاہدہ میں ہے وہ یہ ہے کہ نظام نے محمد علی کو نواب کرناٹک تسلیم کر لیا گویا اب وہاں انگریزی راج کا کوئی خطرہ نہ رہا۔ اس زمانہ میں چونکہ گورنمنٹ دیگر قضیوں میں مبتلا رہی اور بالخصوص حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی لڑائیاں رہیں لہذا کوئی خاص عنایت سرکار نظام پر مبذول نہ ہوگی۔

مگر جونہی ۱۷۹۲ء میں سلطان ٹیپو سے صلح ہوگئی تو کچھ دنوں بعد ہی قضیہ ضلع گنتور شروع ہوگیا۔ ضلع گنتور پر آصفجاہ کے صاحبزادے نواب بسالت جنگ قابض تھے، انگریزوں نے اس کا مطالبہ شروع کیا اور اعلیحضرت نواب نظام علی خاں صاحب کو اس کی علاحدگی کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس سلسلہ میں نو لاکھ سالانہ بھی ملتوی کر دیئے گئے جو اضلاع راج مہندری و مصطفےٰ نگر وغیرہ کے معاوضہ میں ملا کرتے تھے اور جن کا ہرگز ہرگز گنتور سے کوئی تعلق نہ تھا۔

آخرکار ۱۷۸۸ء میں ضلع گنتور بھی انگریزوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں نہایت اہم قابل ذکر جو بات ہے وہ لارڈ کارنیوالس کا وہ خط ہے جو بنام آصفجاہ ثانی

میر نظام علی خاں صاحب آیا تھا۔

اگرچہ اس خط میں بھی سرکار نظام کی وفاداری کو دہرایا گیا ہے مگر اس خط کا لہجہ نہایت سخت اور تحکمانہ ہے۔ اور صاف صاف اس میں بتا دیا گیا ہے کہ ہم اُسی سے صلح کریں گے جو خود صلح کا ہاتھ ہماری طرف بڑھائے۔ ہم ملک معظم شاہ انگلستان کی عزت کے حامل ہیں۔

اس خط میں بہت کچھ غرور و استبداد کی داد دی گئی ہے، اس خط کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ [illegible] میں پارلیمنٹ لندن نے خط پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اور اعلان ہو گیا کہ یہ خط بھی ایک صلح نامہ ہے۔ گنتور کے الحاق کے بعد وہ فوائد جو دیگر اضلاع کے متعلق میں تھے بحکم جاری ہوگئے۔

۱۷۸۹ء میں جب سلطان ٹیپو نے ٹراونکور کے خلاف حملہ شروع کر دیا تو انگریزوں نے ایک نہایت اہم معاہدہ نظام سے کیا اور اس میں مادھو راؤ نرائن کو بھی شریک کیا گیا۔

یہ معاہدہ چار جولائی ۱۷۹۰ء میں ہوا۔ گویا انگریز اور سرکار نظام اور مادھو راؤ نے نمایاں متفقہ طور پر سلطان کے خلاف متحد ہو گئے۔ یہ معاہدہ نہایت ہی سخت تھا۔ اور بہت ہی عجیب و غریب باتوں سے مملو۔

معاہدہ کے شرائط میں یہ بھی ہے کہ سرکار نظام ۱۰ ہزار فوج سے اس حملہ میں شرکت کریں گے اور اس عظیم الشان جرار لشکر کا تمام صرفہ بھی سرکار نظام کو ہی برداشت کرنا ہوگا، اس کے سوا دس ہزار لشکر جرار کا مزید انتظام سرکار نظام کرے جو ولایت بہادر کے ہمرکاب رہے گی۔ کیونکہ وہ ولایت بنفس نفیس اس حملہ میں شرکت فرمائیں گے۔

اس قدر بار عظیم کو خدا جانے سرکار عالی نے کس کس مشقت سے پورا فرمایا ہوگا۔ اس کے معاوضہ میں یہ امید تھی کہ جو کچھ مال غنیمت حاصل ہوگا اُس کا ایک ثلث نظام کو ملے گا لیکن ایک استثناء یہ خیال میں رہے کہ اگر کمپنی کی فوجوں نے تنہا کچھ فتح کیا یا مال حاصل کیا تو وہ انگریزی فوج کا بلا شرکت غیرے ہو۔ اس کے برعکس یعنی اگر نظام کی فوج نے تنہا کچھ حاصل کیا تو کیا وہ بھی اسکی تنہا ملک ہوگی؟ معاہدہ اس سے ساکت ہے۔ حالانکہ معاہدہ کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ آسانی سے نکل سکتا ہے کہ مقصد یہ ضرور تھا کہ نظام کی فوج کو تنہا بھی میدان کا زار گرم کرنا پڑے گا کیونکہ معاہدہ میں صاف صاف طور پر یہ درج ہے کہ سرکار عالی کی افواج کو یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہم کو تنہا کیوں لڑایا جا رہا ہے یا ہم تو مشترکہ طور ہی پر لڑیں گے۔ بلکہ جیسا موقع ہوگا دیا

کرنا پڑے گا یعنی اکثر موقع پر تنہا جان فروشی دکھانا پڑے گی۔ وغیرہ وغیرہ

اسی سلسلہ میں ایک معاہدہ اور ہوا جس میں یہ بتایا ہے کہ انگریزی فوج کا تقرر ہوا کہ سرکار نظام کی حفاظت کریں گے اور جس کے مصارف ۲۰ لاکھ سے بھی زیادہ ہوں گے۔ سب سے زیادہ عجیب و غریب لطیفہ یہ ہے کہ فوج رکھی تو گئی ہے سرکار عالی کی حفاظت کے لئے مگر معاہدہ میں یہ شرط بھی ہے کہ بوقت ضرورت سرکار نظام سے جو احکام جنگ صادر ہوں گے اُن کی تعمیل سے پیشتر حکام انگریزی اس پر غور کریں گے کہ وہ کہاں تک قابل عمل ہیں۔ کیا خوب۔

گویا سرکار عالی کی حفاظت حسب منشاء حکام انگریزی ہوا کرے گی۔

اس فوج کی برطرفی کیلئے بہت ہی گول اور بے معنی سا ایک فقرہ یہ ہے کہ اگر گورنر جنرل اس فوج کی برطرفی کا خط لکھیں تو سرکار عالی اس کو سوچ کر برطرف کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر وہ خط نہ لکھیں تو کیا ہو اس کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔

آخرکار ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی اور سرکار عالی میں معاہدہ ہوا جس کی رو سے ایک غیر معین مدت کے لئے یہ فوج نظام کی محافظ جان بن کر حکومت دکن کے گلے کا ہار رہے گی۔

اس فوج کے متعلق بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں۔ مگر ہم ان کو اس موقع پر اس لئے تحریر نہیں کرتے کہ اسی خطبہ صدارت میں اعلیٰحضرت حضور پرنور آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا وہ خاص حالیہ والا نامہ جو بنام لارڈ ریڈنگ ہے نقل کریں گے جس میں اس فوج کے متعدد پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

یہیں اس معاہدہ کے صرف ایک جملہ پر کچھ لکھا ہو کہ اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ معمولی قضیوں میں یہ فوج مداخلت نہ کرے گی۔ گویا اس لشکر ظفر پیکر کی شان سے یہ بعید ہو کہ معمولی جھگڑوں کو رفع کرے اور چھوٹے چھوٹے قضیوں کا فیصلہ کرے۔ یہ فوج معمولی وار کرنا نہیں جانتی۔ بلکہ جب کوئی اہم جنگ چھڑ جائے اس وقت یہ فوج کام میں لائی جا سکتی ہے بات تو معقول ہو مگر بدقسمتی سے یہ تشخیص کہ کونسا فساد عظیم ہے اور کونسا قلیل وہ جب تک ہوگی اس وقت تک ریاست کے نقصانات جو کچھ ہو گا ہوں گے ہو چکے ہوں گے۔ بعد کو حادثہ ہوا تو کیا۔

یہی وہ فلسفہ سیاست ہے جو کبھی ایشیا والوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اس معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر پیشوا اور سرکار نظام میں اختلاف ہو جائے تو انگریز

اس میں مداخلت کرکے اس کا تصفیہ کردیں گے۔ گویا دبے لفظوں میں یہ کہا جاتا ہو کہ اب ہم ان دونوں حکمرانوں سے زیادہ طاقتور ہو چکے ہیں۔ غالباً یہ پہلی آواز تھی جس سے استقلال دکن کو صدمہ پہونچا ہے۔ یہ معاہدہ بہت طویل ہے مگر اختصار کی خاطر اسی پر اکتفا کی جاتی ہے

گزشتہ معاہدوں کی بنا پر سلطان کے خلاف جنگ جاری کی گئی۔ اور آخر کار سلطان شہید کی تقدیر نے یاوری نہ کی اور اس کا تمام ملک مفتوح ہوگیا۔ تو ۱۷۹۹ء میں کیے بعد دیگرے دو معاہدے ہوئے جس میں سلطان کے مال غنیمت کو تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم کس اصول پر ہوئی اس بحث کو ترک کرکے مان لیجیے کہ خلاف توقع نظام کو وہ دیا تجویز ہوا جس کے وہ معاہدہ کی رو سے مستحق تھے لیکن سوال تو یہ ہے کہ سرکار عالی کو ملا کیا۔ اس کا جواب اس قدر دردناک ہے کہ انصاف پسند قوت سامعہ اس کو کسی طرح نہیں سن سکتی۔

۱۸۰۰ء میں جو معاہدہ ہوا تو انگریزی فوج کے مصارف کے عوض نظام کو ان تمام حقوق سے دست بردار ہونا پڑا جو سلطان کو فتح کرنے کے بعد بطور ثمر فتح سرکار عالی کو ملنا چاہیے تھے۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بدلے میں وہ نو لاکھ سالانہ بھی بند ہوگئے جو مغلی سرکار کا معاوضہ تھا۔

سب سے زبردست یہ کہ اس معاہدہ میں یہ بھی طے کرالیا گیا کہ آئندہ سے گورنمنٹ نظام بغیر اجازت آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی سے صلح کرسکتی ہے نہ کسی سے جنگ بلکہ معاہدات تجارت میں بھی حکومت نظام آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے پابند ہے۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس معاہدہ نے ایک اسلامی آزاد سلطنت کی خود مختاری پر جس قدر کاری ضرب لگائی ہے وہ ایسی ہے کہ اس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ اور جس قدر خون کے آنسو بہائے جائیں تھوڑا ہے۔

یہ سب وہ امور ہیں جن کو یورپین سیاست کا کرشمہ کہیے یا مسلمانان ہند کی غفلت شعاری کا نتیجہ؟

کس کس معاہدہ کو ادا کیا جائے اور کس کس بات کا مرثیہ پڑھا جائے۔ اور کہاں تک کف افسوس ملے جائیں۔ اور سادہ سیاست کو کس طرح سمجھا جائے کہ نظام گورنمنٹ اور مرہٹوں میں ... انگریزی سیاست کی یہ حالت ہے کہ کبھی یہ ریزیڈنسی کا معاہدہ

مرہٹوں سے اور کبھی ریزیڈنسی کا عہد نامہ نظام سے ہو۔

بہر حال یہ داستان غم بہت ہی طویل ہے اور اس کا ہر باب نہایت ہی دردناک ہے تمام باتوں سے قطع نظر کرکے صرف "مسئلہ برار" پر ہی نظر ڈالیے۔ کیا کوئی منصف مزاج شخص جس کو انصاف سے کم از کم صرف ایک منٹ کے لیے بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں اعلیحضرت آصفجاہ سابع شہریار دکن خلد اللہ ملکہ کا مطالبہ کسی طرح بھی ناقابل قبول ہے۔ اور منصف دنیا حضور پرنور کے اس تحریر کے ایک حرف کا بھی رد کرسکتی ہے۔ جو سرکار عالی نے بنام ہز اکسلینسی لارڈ ریڈنگ لکھی ہے۔ میں اس تحریر کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اور آپ کو آپ کے خدا آپ کے دین۔ آپ کی دیانت۔ آپ کے انصاف کی قسم دیکر دریافت کرتا ہوں۔ کیا اس کا جواب وہ ہوسکتا ہے جو لارڈ ریڈنگ نے دیا۔ مراسلہ سرکار عالی اور لارڈ ریڈنگ کا جواب دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔

حضور نظام کی تحریر بنام لارڈ ریڈنگ

کلام الملوک ملوک الکلام

کنگ کوٹھی
حیدرآباد دکن

مائی ڈیر لارڈ ریڈنگ۔ آپ آگاہ ہیں کہ صوبہ برار جو میرے ممالک محروسہ کا ایک بڑا لاینفک جز ہے۔ بعض شرائط پر ۵ نومبر ۱۹۰۲ء کے ایک معاہدہ کے ذریعہ حکومت برطانیہ کو دوامی پٹہ پر دیدیا گیا تھا۔ یہ اس ملاقات کا نتیجہ تھا جو لارڈ کرزن وائسرائے ہند اور میرے والد مرحوم میر محبوب علی خاں کے مابین حیدرآباد میں اسی سال ۲۰ مارچ کو واقع ہوئی تھی۔ فی ۱۹۱۱ء میں جب اپنے آبائی تخت پر بیٹھنے کے بعد میں نے ان حالات کی بہت غور و خوض سے جانچ کی جن کے تحت یہ معاہدہ منعقد ہوا تھا۔ اگر ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کا آغاز نہ ہوجاتا تو میں اس سے بہت ہی قبل معاہدہ مذکورہ کے غور مکرر کی درخواست کرتا۔ لیکن حکومت برطانیہ کے ایک حلیف کی حیثیت سے میں نے اس کو اپنا فرض خیال کیا کہ اپنی مملکت کی ساری قوتیں جنگ میں لگادوں اور ایسے زمانہ میں اس سیاسی مسئلہ کو اٹھانے سے باز رہوں۔ جبکہ ایک عالم حیات و ممات کی صعوبتوں میں پھنسی ہوئی ہو اور مقابلہ پر ایک زبردست دشمن ہو۔ تاہم میرا ارادہ تھا کہ اختتام جنگ پر اس کے متعلق کارروائی کروں۔ لیکن برطانوی ہند میں

ہز ایکسیلنسی اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے ۔۔۔ انکو برخت ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں از ہز کی
نظام نے ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے ذریعہ جبر کے تحت تسلیم کرلیا۔ اور اسکو انہوں نے کبھی بھی وہ اچھی
طور پر قابل ادائیگی نہیں تصور کیا۔ نیز انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ انکی رائے میں اگر ان معاملات پر غیر جانبدارانہ
نظر ڈالی جائے تو پھر اس موجودہ قرض کے لئے نظام پر ہمارا کوئی منصفانہ دعویٰ نہیں ہے۔

ف۱۳ جس دباؤ کا اشارہ کرنل ڈیوڈسن نے کیا ہے وہ یہ تھا کہ فی الفور فوجی قبضہ کی
دھمکی دی گئی تھی۔ اولین تجویز یہ تھی کہ اس علاقہ کو ہمیشہ کے لئے دیدیا جائے۔ نظام نے اس سے
انکار کر دیا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ وہ حوالہ کر دیا جائے۔ البتہ برائے نام اس علاقہ پر
نظام کی شاہی تسلیم کی جائے انہوں (نظام) نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ بیکاس دونوں تک انہیں
نظام کو مجبور کیا گیا لیکن انہوں نے اسکو بھی قبول نہیں کیا۔ تو پھر تیسری تجویز پیش کی گئی کہ یہ
علاقہ برطانوی حکومت کو محض اس وقت تک کے لئے کنٹنجنٹ کے قیام کے لئے دیا جائے جب تک
کہ نظام اس فوج کی ضرورت محسوس کریں۔ الزامات لگائے گئے تھے، اور دھمکیاں دی گئیں تھیں
لیکن اور چند روز تک نظام غیر متزلزل رہے اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ کرنل
اسسٹنٹ رزیڈنٹ کا ایک خط نظام کے مدار المہام کے نام آیا جس کی عبارت سے بیرت کا
حال ذیل کے اقتباس سے واضح ہو گا۔ میں باور کرتا ہوں کہ رزیڈنٹ کو آج تمام آپ کی
حضوری درکار ہے تاکہ آپ کو اطلاع دیں کہ نظام سے انکی گفت و شنید ختم ہو گئی ہے اور
وہ بیچ ڈاک سے گورنر جنرل سے درخواست کریں گے کہ افواج کو حرکت دیں اسے یہ ہے کہ
مجھے لیفٹیننٹ کا ایک خط ملا ہے جو اس بیچ تھا وہ ابھی درج ہے کہ دس مائی ایسٹ ... اور
... رجمنٹ ایچ ایم افواج کو حیدرآباد پیشقدمی کے لئے تیار رہنے کے احکام مل گئے ہیں۔
رزیڈنٹ کو فوجی کارروائی صرف اضلاع تک محدود رہیگی۔ اور اگر آپ ہز ہائینس کے دوست
ہیں تو ان سے درخواست کیجئے کہ اپنے آپ کو اور اپنے وقار کو اس امر کو قبول کر کے بچالیں
جس کے قبول کرنے پر گورنر جنرل یقیناً انہیں مجبور کرینگے۔ اس خط کے وصول ہونے کے
دوسرے روز مدار المہام نے رزیڈنٹ کو لکھا کہ حضور نظام اس معاہدہ پر رضامند ہو گئے ہیں
سیر تنقید حاصل ہے اب اس امر کا تصفیہ پورا ایکسیلنسی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ منظوری زبردستی
سے کی یا جبر کے تحت دی گئی تھی۔

ف۱۴ مسٹر کی یادداشت میں تفصیلاً وضاحت کے ساتھ اس انتہائی بیداد کا حال درج ہے

بحیثیت ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی گفت و شنید ختم ہوئی کرنل لو نے (جو بعد میں جنرل سر جان لو ہوئے) جو اس وقت
رزیڈنٹ تھے نظام سے کھلم کھلا اعلان کیا کہ اگر ہز ہائینس کی خواہش ہے تو کنٹنجنٹ کے قیام کیلئے
جو اضلاع اسکی ضرورت محسوس ہو اس وقت تک کے لئے یا اضلاع حوالے کئے جا سکتے ہیں"۔ اس موضوع
کے متعلق اخبار و کاغذات کا سرسری مطالعہ مجھے یقین ہے کہ ہز ایکسیلنسی کو اس بات کا یقین
دلادے گا کہ نظام دوامی حوالگی کے تصفیہ کی تجویز کو شدت سے ناپسند کرتے تھے۔ اور یہ
کہ انہوں نے ۱۸۵۳ء کے معاہدہ پر اس بے دریغ انہماک کے ساتھ دستخط کئے تھے انتقال قبضہ برائے
ایک غرض خاص کے لئے تفویض اختیاری ہے جو محض اس وقت تک رہیگا جب تک کہ اس مقصد
کے قیام کی ضرورت باقی ہے"

ف۱۵ نظام کا یہ پہلے سے فیصلہ ہو رہا تھا کہ جب بھی جاہے کنٹنجنٹ کو توڑ دیں اور معاہدہ
کے کسی دفعہ کا بالتحت رہ جات ۱۸۵۳ء کے معاہدہ سے بغیر متاثر رہا ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء کے مابین
کاغذات میں کچھ ایسے سوانح مختلف پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام نے متواتر بیچے
آپ کو مفوضہ اضلاع برار کے استرداد کا مستحق قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ۱۸۶۰ء کا معاہدہ
قرار پایا جو معاہدہ تھیم ہے اور اس سے ریاست حیدرآباد کو ان اضلاع کے متواتر قبضہ اور
کامل استرداد کی دعاوی پر جنہیں میرے جد بزرگوار نظام افضل الدولہ اور میرے جد
امجد اس وقت عزیز رکھتے تھے ضرب پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ انکا دائرہ تنگ کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف
اس کے اس معاہدہ کے دفعہ ۶ میں ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے تحت مفوضہ علاقہ صاف صاف طور پر
حوالہ دیا گیا ہے۔

ف۱۶ حیدرآباد کنٹنجنٹ کی افواج کے علاوہ اخراجات کے لئے حکومت برطانیہ کے پاس ...
اور دیگر جو بچے اخراجات کے لئے بھی حکومت ہند کی ۔ ۔ ستمبر ۱۸۹۰ء کی اس کارروائی کو
یہ نتیجہ تھا جسکی رو سے رزیڈنٹ کو سرکاری طور پر مجاز گردانا گیا تھا کہ نظام کو لکھے کہ ان کے
تالف ... کہ اس حصہ کے علیحدگی محض عارضی ہے اور ایک خاص غرض کے لئے جو خاصکر
ریاست حیدرآباد کی سلامتی اور اس کے سرحدات کی اندرامن و امان کے تحفظ کی بہبود
حامی ہے اور یہ کہ جب بھی اضلاع زیر بحث نظام کو واپس کئے جائنگے ہز ہائینس ان منافع سے
استفادہ کرتے رہینگے جو ان اضلاع و ترقی سے پیدا ہوں جس کا ظہور برطانوی
عہدہ داروں کے انتظام کے تحت ہوا ہے۔

ق اس تاریخی صراحت سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ ان حالات سے جن کے تحت ۱۸۵۳ء و ۱۸۶۰ء کے معاہدات منعقد ہوئے اس نظریہ کی تائید میں کوئی قطعی نتیجہ نہیں مستخرج ہو سکتا کہ نظام یا حکومت ہند نے کبھی ایسا خیال کیا یا کسی زمانہ مستقبل میں کنٹجنٹ کے توڑنے کے حق کو ساقط کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہو۔ میرے خیال میں یور اکسلنسی ایک اعلیٰ پایہ کے حاکم عدالت و قانون پیشہ کی حیثیت سے میرے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ میرے آباؤ اجداد نے میرے دادا نظام افضل الدولہ کے عہد حکومت تک کسی ایسے تغیر پر رضامندی نہیں ظاہر کی جس سے ان کے حق پر دائمی بٹہ لگ جائے کہ وہ اپنے خانوادہ کو برار کے مسترد کرنے میں اپنے اختیاری تمیزی کو ہر اس وقت کام میں لائینگے جبکہ سارے دیون کا تصفیہ ہو جائے اور ان کے نزدیک قیام کنٹجنٹ کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ف میرے دادا نظام افضل الدولہ نے ۱۸۶۹ء میں انتقال فرمایا اور انکی جگہ میرے والد نظام محبوب علی خاں تخت نشین ہوئے جو تخت نشینی کے وقت محض ایک طفل ۳ سالہ تھے۔ فرمانروا کی طفلی کو جب سر سالار جنگ نائب اور امیر کبیر نائب مقرر ہوئے ۱۸۷۲ء میں نائب السلطنت مدارالمہاموں نے حکومت ہند سے کہا کہ تجویز پیش کی کہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ میں جن اغراض و مقاصد کا ذکر ہے انہیں کی بنیاد پر کنٹجنٹ فوج کے قیام کے اخراجات کیلئے ایک علاقہ قرار دیا گیا حیدرآباد سے لیجایا گیا ہے اور اضلاع مفوضہ نظام کے نظم و نسق اور حکومت کو مسترد کر دئے جائیں۔ اس تجویز سے انکار کر دیا گیا۔ انکار کی بنیادوں میں ایک یہ بھی تھی کہ "اس نوعیت کے مسائل پر بحث و تمحیص وقت طلب ہے جبکہ خود نظام ہی کی جانب سے یہ مسائل اٹھائے جا سکتے ہیں جو نابالغ ہیں"۔

ق ۱۸۸۴ء میں کامل اختیارات حکومت میرے والد کے ہاتوں میں آئے جبکہ وہ سن بلوغ کو پہنچے ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے جو اسوقت وائسرائے تھے مسئلہ برار کو اپنی جانب سے اٹھایا اس کے بعد جو معاملات ہوئے انکی میں جتنی زیادہ جانچ کرتا ہوں اتنا ہی مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میرے والد بھی تعویق دوامی کی تجویز سے اس کے کم متنفر نہ تھے کہ ان کے آباؤ اجداد تھے۔ حکومت ہند کے پیام و سلام مجوزہ انتقال پٹہ کے [illegible] رزیڈنٹ حیدرآباد وقت کے توسط سے میرے والد کو لکھا گیا ختم جنوری ۱۹۰۲ء سے شروع ہوئے۔ اس کے آٹھ ہفتوں کے اندر ہی

حیدرآباد میں لارڈ کرزن کا تاریخی ورود ہوا جس کا انجام یہ ہوا کہ برطانوی حکومت کو اضلاع برار دوامی پٹہ پر مل گئے۔

ف یادداشت منسلکہ سے ظاہر ہوگا کہ میرے والد دوامی پٹہ کی تجویز کو کس درجہ ناپسند فرماتے تھے۔ کسطرح آپ برابر رزیڈنٹ کے پیام و سلام کی مقاومت کرتے رہے اور کس شدومد کے ساتھ ایک مجلس امراء نے جو خاص اسی معاملہ میں غور و خوض کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ بالآخر اس مجلس نے ایک خط کا مسودہ تیار کیا تھا جو نظام کی جانب سے وائسرائے کو بھیجا جانے والا تھا اور اس میں ہز ہائنس کو مشورہ دیا گیا تھا کہ اس خط کو وہ اس پیچ کی گفتگو میں وائسرائے کو دیں جو وائسرائے کے حیدرآباد آنے پر رزیڈنسی میں ہونے والی تھی۔ میری نظر میں یہ خط ایک دستاویز انتہائی اہم ہے نہ صرف اس لئے کہ اس کی عبارت ایسی دردانگیز ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ملاقات ایسی اچانک ہوئی کہ میرے والد اس خط کو وائسرائے کے ہاتھ تک نہ پہنچا سکے۔ یہ خط جو ۳۰ مارچ ۱۹۰۲ء کا لکھا ہوا ہے حسب ذیل ہے:-

یور اکسلنسی میں نہیں چاہتا تھا کہ استرداد برار کے متعلق اپنے حق کے قدیم جھگڑے میں قدم رکھوں یا اس کے متعلقہ معاہدات و دیگر رسمی مصروفیتوں کے مفہوم و مقصد کی بحث کو تازہ کروں میں اعتماد کے ساتھ ان معاملات کو یور اکسلنسی کے کرم فرما لطف آمیز غور و نظر پر چھوڑتا ہوں۔ میں محض آپ کے توسط سے ملک معظم سے اپیل کروں گا کہ الطاف و عنایات کی ایک خاص علامت کے طور پر برار مسترد کر دیں اور میں آپ سے اتنی اجازت پانے کی درخواست کرتا ہوں کہ کہوں کہ یور لارڈشپ اس معاملہ میں میری وکالت فرماویں۔ مجھے اس بات کا کامل یقین ہے اور میں پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ میری یہ اپیل ملک معظم کی تاج پوشی کی مبارک موقع پر بیکار نہ جائے گی۔

(میں ہوں یور اکسلنسی کا مخلص دوست)

ق منسلکہ یادداشت کے مندرجہ مکمل حالات ملاقات سے یہ بات بالکل صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ وائسرائے نے اس امید کے لئے نظام کی حوصلہ افزائی نہیں کی کہ ہز اکسلنسی ملک معظم کے آگے ہز ہائنس کی وکالت فرمائینگے۔ اگرچہ رزیڈنٹ کرنل بار وائسرائے کے ہمراہ تھے لیکن اس غایت درجہ اہم مسئلہ کی بحث کے دوران

اشخاص کے تسلط کے تحت رکھی گئی ہو۔ مثلاً نا موافق تعداد کے باعث جیسے کہ مجھے
اطلاع ملی ہی صوبجات متحدہ کی مجلس تشریع میں انھیں ادنیٰ جگہ ملی ہی یعنی ۱۹۲۰ء کے
بعد سے صورت حال ایسی کامل بدل گئی ہی کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس درخواست میں اپنے
حقوق کے اندر ہوں۔ عدل و انصاف کے ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے اسوقت کے
منعقدہ مجوزہ پر نظر ثانی کیجائے۔

(۱۷) میں اس کے لئے تیار ہوں کہ میری برار کی رعایا اپنی قسمتوں کی صورت
گری اپنے ہاتوں میں لے لے۔ اور اس بنا پر میں استرداد صوبہ کے بعد اس نظم و
نسق صوبہ میں ایسے وسیع پیمانہ پر اشتراک عمل کی اجازت دینا چاہتا ہوں۔ جو برطانوی
ہند میں اسوقت کہیں کی رعایا کو حاصل نہیں ہی۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلان
کرتا ہوں کہ اگر میں اپنے صوبہ کے لینے میں کامیاب ہو جاؤں تو میں وثیقہ استرداد یا کسی اور
ریاستی دستاویز میں جو لکھی جائے گی براریوں کو ایک ایسی ذمہ دار حکومت کے دستور کے
عطا کئے جانے کے متعلق معین دفعات درج کرونگا جس کی رو سے ایک ایسی گورنر کے
تحت جو میری جانب سے میرے نمائندہ کی حیثیت سے مقرر ہو، معاملات داخلہ اور
نظم و نسق میں کامل انتظامی اختیارات کیلئے اقتدار عامہ مطلقہ حاصل ہو جائیگا۔ باستثناء ان
معاملات کے جو حکومت برطانیہ اور میرے محکمہ افواج سے متعلق ہوں۔

(۱۸) ان مباحث مالیہ کو جنھیں ۱۹۰۲ء کی گفت و شنید میں بڑی اہمیت دی گئی تھی استرداد
کی راہ میں حائل ہونے کی ضرورت نہیں ہی۔ یہ سارا معاملہ جسکو میں اہمیت دیتا ہوں
ذی حقیقت کا نہیں۔ بلکہ حق و انصاف کا ہی آخری وصول باقی (تصفیہ حسابات) کے متعلق
میں ایک منصفانہ تجویز سے زیادہ کسی اور چیز کی درخواست نہیں کرتا۔

(۱۹) برطانوی شہنشاہیت کی پائداری کے لئے میرے آبا و اجداد نے اور خود میں نے
جو کچھ کیا اور دیا ہے وہ تاریخی معاملات ہیں۔ میں نے انکا ذکر بھی نہیں کیا۔ اس لئے کہ یور ایکسلنسی
کے نام میں نے جو مراسلہ لکھا ہی اس سے یہ منشا نہیں ہی کہ ایک یار وفادار نے جو کام اپنی
محبت سے انجام دئے ہیں انکا کوئی انعام طلب کیا جائے۔ بلکہ یہ کہ میرے جو حقوق ہیں وہ ان کا اقرار کرے
اور ملک معظم کی حکومت کے ہاتوں انصاف پائے۔

آپکا مخلص

(میر عثمان علیخان)

لارڈ ریڈنگ کے جواب کا خلاصہ جو چلتے چلتے اُنہوں نے سرکار عالی کے حوالہ کیا حسب ذیل ہے

تاجدار برطانیہ کے خسروانہ اقتدار کو ہندوستان میں تمام طاقتوں پر فوقیت حاصل ہی
اس لئے اس ملک کا کوئی والی ریاست حکومت انگریزی کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے
گفت و شنید کرنے کے مطالبہ میں حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ حکومت موصوفہ کا تفوق معاہدات
ہی پر مبنی نہیں ہی بلکہ ایک جداگانہ وجود رکھتا ہی اور اس اقتدار خصوصی سے قطع نظر
جو کہ تاج کو امور خارجیہ کے انصرام اور دول اجنبیہ کے ساتھ گفت و شنید کی بابت
حاصل ہی، حکومت انگریزی اس بات کی مقتدر ہی اور اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہی کہ
اپنی معاہدات کے مراتب کی پابندی کے ساتھ ہندوستان میں امن و امان قائم رکھے۔
ان تمام باتوں سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کی رو سے صاف طور پر آپ کی ذات پر بھی
ہی لیکن اگر خیال دیگر اس مسئلہ کی وضاحت ناگزیر ہو تو میں یور اگزالٹیڈ ہائینس کو یاد دلاؤں
کہ دوسرے والیان ریاست کی طرح فرمانروائے حیدرآباد کو ۱۹۲۰ء میں ایک سند
مرحمت ہوئی تھی جس میں حکومت برطانیہ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ حیدرآباد
کی حکومت ہمیشہ کے لئے خاندان آصفیہ سے وابستہ رہے لیکن اس خواہش کو اس شرط سے
مشروط کر دیا تھا کہ یہ خاندان ہمیشہ تاج برطانیہ کی وفاداری کا دم بھرتا رہے۔ سند
حیدرآباد کا حق وراثت ملک معظم قیصر ہند کے صوابدید کے تابع ہو اور اگر جانشینی کی
بابت میں کوئی نزاع ہو تو صرف حکومت انگریزی ہی اس نزاع میں ثالث ٹھیرے گی
تاج برطانیہ کی برتری کے ساتھ لازمی طور پر جو نتائج وابستہ ہیں ان کی مزید تشریح
مطلوب ہو تو حکومت انگریزی کا یہ حق پیش کیا جا سکتا ہی کہ وہ دیسی ریاستوں کے
اندرونی معاملات میں مداخلت کی مجاز ہی۔ میں مانتا ہوں اور حکومت انگریزی نے
ہمیشہ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا ہی کہ جب تک صورت حال ناگزیر نہ ہو جائے تو
وہ اپنا یہ حق استعمال نہیں کرنا چاہتی لیکن اس حقیقت نفس الامری سے بھی انکار نہیں
ہو سکتا کہ والیان ریاست ہائے ہند کو بیرونی حضرات سے امن ہونے کی طرح اندرونی
امن کے جو برکات نصیب ہیں وہ انگریزی حکومت ہی کی بناہ دہی کا ثمرہ ہیں۔ بس

جب کوئی واقعہ برطانیہ کی شاہنشاہانہ مفاد پر موثر ہوگا یا کسی ریاست کے باشندوں
کی فلاح اُس کے حکمران کے عمل سے خطرہ میں پڑ جائے گی تو بشرط ضرورت انسدادی
تدابیر اختیار کرنے کی ذمہ داری حکومت ہی پر عائد ہوگی۔ امور داخلیہ میں والیان
ریاستہائے ہند کو جو متفاوت المدارج فرمانروایانہ اختیارات حاصل ہیں وہ سب کے
سب اسی ذمہ داری کے تابع ہیں۔ اور بھی اسی قسم کی مثالیں یور اگزالٹیڈ ہائنس
کے اس خیال کی تردید کرتی ہیں کہ امور خارجیہ کو چھوڑ کر باقی تمام معاملات میں دولت
آصفیہ اور دولت برطانیہ کا درجہ ایک ہے۔ اب میری رائے میں اس بحث کو طول
دینے کی حاجت نہیں۔ البتہ اتنی بات یور اگزالٹیڈ ہائنس کو اور جتائے دیتا ہوں کہ
یار وفاداراں لقب سے آپ ملقب ہیں اس کا یہ اثر نہیں ہے کہ آپ کی حکومت کا
شمار ان ریاستوں سے الگ کسی دوسرے زمرے میں ہونے لگے جو تاج برطانیہ
کی سیادت کے سایہ میں ہیں۔

اجمالی تبصرہ

ہم بار بار لارڈ ریڈنگ کے خط کو پڑھتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش
کرتے ہیں مگر اس میں ایک حرف بھی ایسا نہیں پاتے جسکو سرکار عالی کے مراسلہ
کا جواب تصور کریں۔ جتنے جتنا غور کیا اسی قدر حیرت و استعجاب میں زیادتی
ہوئی کہ وائسرائے ہند جن اتفاق سے کبھی چیف جسٹس بھی رہ چکا ہو سارے
مدلل دعوی کو محض ایک قوت و استبداد، تفوق و برتری کی تیغ [illegible] خارج کردیتا ہے
اور تمام استدلال جسکی بنا یا تو بھی تاریخ ہے یا انگریزی معاہدہ جات وہ بھی
ان کے دل کو اپنی حقانیت سے متاثر نہیں کرسکتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی انگلیشمین
میں کسی اہم معاملہ پر اس قدر بے توجہی برتی گئی ہو اور میرے خیال میں انگلینڈ
میں بھی کوئی عدالت خواہ وہ حکومت برطانیہ ہی کے ماتحت عدالت ہو اس طریقہ
استبداد کو اپنے معیار انصاف جتا سکے۔
بجائے اس کے کہ وائسرائے بہادر سرکار عالی کے تحریر فرمائے ہوئے معاہدات
پر نظر ڈالتے اور ان کے جواب لکھنے پر توجہ فرماتے اپنے حقوق جتانے لگے

کہ سرکار برطانیہ کو اندرونی معاملات میں بھی حق مداخلت ہے اور دوسرا نشست دکن کا
مسئلہ بھی ملک معظم کی منظوری کا محتاج ہے۔ اگر ذرا اس سے زائد غور کیجئے اور بعید
سے بعید احتمال کو پیش نظر رکھئے تو اس جواب کا اس خط سے یہ تعلق ہو جاتا ہے کہ
اگر سرکار نظام نے مطالبہ برار کو ترک نہ کیا تو ہمارے پاس انکو مرعوب کرنے کے
اور بھی ذرائع ہیں۔ وائسرائے بہادر احسان جتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ریاست حضور
کے بیرونی خطرات سے حفاظت اور اندرونی فساد سے مامونی برٹش پناہ دہی کا
ثمرہ ہے۔ کیا کوئی لارڈ موصوف سے سوال کرسکتا ہے کہ فرانسیسیوں کے اخراج اور
سلطان ٹیپو کی شکست سے جو ثمرات برٹش حکومت کو ملے اُن میں سرکار نظام
کی امداد و اعانت کو کہاں تک دخل ہے۔ اور کیا لارڈ موصوف اس سوال کی
اجازت دیجئے کہ ہمارے خط میں سے دیگر دو چیزیں ہیں ایک ۱۸۶۲ء کی سند۔
دوسرے یہ کہ معاہدات کے علاوہ بھی انگریزی حقوق برتری ایک وجود
رکھتے ہیں۔ ۱۸۶۲ء کی سند کے متعلق ہم بہت کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن اسوقت
صرف اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں کہ کیا اس سند سے لارڈ ولزلی کے معاہدہ کی
تنسیخ مقصود تھی جس میں ایک شرط صاف یہ درج ہے کہ نظام اپنی رعایا اپنی
اولاد اپنے خاندان کے متعلق جو چاہیں تصفیہ کریں انہیں آزادی ہے"۔
اور کیا دوسرے جملہ کا یہ مطلب ہے کہ معاہدہ ہو یا نہ ہو حکومت کا طرز عمل جو ہے وہ
سب سے بڑھکر معاہدہ ہے۔ اچھا۔ تو کیا لارڈ ریڈنگ سابق وائسرائے ہند
مسٹر لارڈ ہارڈنگ سے دریافت کرنے کی زحمت گوارا فرمائینگے کہ انکے دور حکومت
میں غفران مکان اعلیحضرت میر محبوب علی خاں کی وفات حسرت آیات
کے بعد جب تخت حیدرآباد دکن پر اعلیحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائنس نواب
میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ جلوہ افروز ہوئے تھے تو یہ تخت نشینی
حسب رواج خاندان آصفیہ امرائے دولت و اراکین ریاست کے ہاتھوں عمل
میں آئی تھی یا کرنل پنہے ریزیڈنٹ و لارڈ ہارڈنگ کے استصواب کے بعد مسند
نشینی ہوئی تھی۔
اگر لارڈ ریڈنگ کو اپنے لائق اور ہردلعزیز پیشرو سے سوال کرتے ہوئے

پھر حجت نہ ہو تو شاید انکو اطمینان بخش جواب ملجائے اور وہ خود ہی اپنے جواب
کو ناواجبی تصور کرنے لگیں یہی نہیں کہ لارڈ ارون کو لارڈ ریڈنگ کے طرز
عمل سے اتفاق نہ ہوگا بلکہ اور شعبہ وائسرائے بھی سنہ ۱۹۲۶ء کے سند کا وہ مطلب
سمجھے جو لارڈ موصوف کے دماغ میں آیا ہے اور نہ وہ ان خیالی برتری کو معیار عمل بنائینگے
جو لارڈ ریڈنگ کا منشا ظاہر معلوم ہوتی ہیں۔ جو حضرات لارڈ ارون کے تقریر میں جو انہوں
نے دعوت کے موقع پر ریاست ہائے ہند میں فرمائی تھیں سن چکے ہیں وہ ہمارے
بیان کی تصدیق کرینگے۔

بہر حال۔ ہمارے خیال میں جو کچھ بات آفتاب نصف النہار کیطرح واضح
کہ حضور پر نور کا خط دکن کی تاریخ میں ہمیشہ سونے کے حرفوں سے لکھا جائیگا۔ اور
لارڈ ریڈنگ کا جواب ہر ہندوستانی کے قلب میں تیر و نشتر کیطرح دیر تک اپنی
خلش قائم رکھیگا۔

لارڈ ریڈنگ جاچکے ہیں اور اب یہ بات موجودہ وائسرائے ہند کے اختیار میں ہے کہ اس
خلش کو باقی رکھیں یا اُس زخم کے اندمال کیطرف متوجہ ہوں جو آپ کے پیشرو نے ہندوستانیوں
کے دل میں چھوڑا۔

افسوس ہے کہ اسوقت تک جو افواہیں گرم اور جو خبریں غیر ذمہ دارانہ طور پر شائع ہوئیں
وہ تو امید افزا ہونے کے بجائے مایوس کن ہیں۔ بالخصوص ایسے وقت میں جبکہ
انگلستان کی حکومت کنسرویٹو طبقہ کے ہاتھ میں ہے بظاہر کسی تغیر کی آسانی سے
امید لگانا مشکل ہے۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام ہندوستان جلد سے جلد
اسطرف توجہ کرے اور اس عظیم الشان خطرہ کو ویسی ہی اہمیت دینا چاہیے جسکی صورت
حال متقاضی ہے۔

حضرات۔ آئیے اب ہم اور آپ اپنے اُن فرائض کی بجاآوری کیطرف
توجہ کریں جو مذہبی۔ اخلاقی۔ ملکی۔ تمام حیثیات سے ہمپر عائد ہو رہے ہیں۔ اور جلد
کوئی ایسی راہ عمل تلاش کریں جو بآسانی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دے۔

نظام عمل

حضرات۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے خطرناک صورت حال کی
اصلاح ہو سکے اور ریاست حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی موجودہ پوزیشن جو باعتبار سابق کم سے کم
ہی بحال باقی رہ سکے۔ جو تمام مسلمانان ہند کی عزت و وجاہت کا مسئلہ ہے۔

یہاں اس امر کیطرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ برادران وطن اس جد و جہد میں
ہمارا کہانتک ساتھ دینگے اور کس حد تک ہمارے شریک عمل رہینگے۔ اس لئے کہ اگر ہم سات
کروڑ مسلمان گورنمنٹ ہند کی اُس پالیسی پر اثر نہیں ڈال سکتے جو کسی رزیڈنٹ کی غضبناکی یا
کسی وائسرائے کی تنگ مزاجی کا نتیجہ ہو تو ہمکو اپنی فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔ اور باور کرنا چاہئے
کہ ہم عنقریب صفحۂ ہندوستان سے حرف غلط کیطرح مٹنے والے ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ واقعات
کی روشنی میں ایسا ثابت نہیں ہوگا۔ ہمکو قومی روایات دیکھتے ہوئے یقین کرنے کے کافی وجوہ
موجود ہیں کہ "ہم ضرور کامیاب ہونگے"

میں ہندو مسلم اتفاق کا حامی رہا ہوں اور اب بھی حامی ہوں اور ہر وہ شخص جو
ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کا خواہشمند ہے وہ ہندو مسلم اتفاق کا حامی ہوگا۔
مگر اس طوفان اتحاد کے زمانہ میں بھی ہم نے مسلمانوں کے اُن اعمال کو نفرت کی نگاہ سے
دیکھا ہے جو اتحاد کے غلو میں کئے گئے اور جن سے ہمارے مذہب کی توہین ہوتی تھی۔ مسجد کے منبر پر
ہندوؤں کو بٹھانا خود مسلمانوں کا قشقہ لگانا وغیرہ وغیرہ بدترین افعال تھے جو ہندوستانی
مسلمانوں کے دامن پر بحیثیت مسلمان ہونے کے انمٹ بدنما داغ ہیں۔

بہر حال وہ مسائل جو ہندوستانی سیاسیات میں ایک مخصوص پہلو رکھتے ہیں اور
اگرچہ غائر نظر کے بعد مشترکہ ہند پر اسکا اثر پڑتا ہے لیکن بظاہر اسکا تعلق مسلم جماعت ہی
سے ہے تو میری غیرت ملی کا یہی تقاضا ہے کہ ان امور میں صرف خدا کے فضل پر بھروسہ
کرنے کے بعد اپنی مسلم جماعت پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ہاں اگر برادران وطن خود شرکت
عمل کے لئے تیار ہوں۔ اور صلح و محبت کا ہاتھ بڑھائیں تو ہمکو بھی انکار کی کوئی وجہ نہیں
مسلم جماعت کو کام میں جو دقت پیش آتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بدقسمتی سے مسلمان
طرح طرح کی فرقہ بندیوں میں مبتلا ہیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی ابھی کچھ کم تفرقہ جماعت
نہیں ہے۔ اور سیاسی اختلاف کے متعلق تو میری یہ رائے ہے کہ سیاسی آراء کی

تعداد اسی قدر ہی جتنی ریاست والوں کی تعداد ہے۔ گویا ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے ہے۔

گو نہایت مسرت او کمال انبساط کیساتھ میں بلا خوف تردید عرض کرونگا کہ ایک اور صرف ہی ایک مقصد وحید ایسا ہے جس میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور تمام فرقوں کی ایک ہی رائے ہے۔

آل پارٹیز حجاز کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں جب حضور اقدس و اعلیٰ کے شکریہ کا رزولیوشن پیش ہوا کہ حضور ممدوح نے اپنے چیف انجینئر کو ان مقامات مقدسہ اور مآثر متبرکہ کا تجدید بنانے کے لئے روانہ فرمایا ہے جنکو وحشی نجدیوں نے برباد کر دیا ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ حضور ممدوح کے شکر گذاروں کی فہرست میں جلیل عالیجناب راجہ صاحب جہانگیر آباد اور عالیجناب سر مہاراجہ محمود آباد جیسے محترم سرکاری اعزاز یافتہ حضرات نے اپنے نام لکھائے، یوں ہی رئیس الاحرار مسٹر محمد علی صاحب اور فدائے ملت سید حبیب شاہ صاحب نے بھی اسکی سپاس گزاری اپنا فرض سمجھا۔ انہیں ایام میں جب بزم صوفیہ کا ایک غیر معمولی جلسہ حضرت سید شاہ مختار احمد صاحب مجلد متولی اجمیر شریف کی فرودگاہ پر حضرت موصوف کی صدارت میں منعقد ہوا تو جب تحریک حضرت مولانا عبدالباری صاحب یہی رزولیوشن پیش ہوا جس کی تائید فقیر نے اور تائید مزید حضرت شاہ سلیمان صاحب نے فرمائی۔

بہرحال اس امر کے یقین کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ خواہ انتہا پسند طبقہ ہو یا سرکاری اعزاز یافتہ حضرات کا گروہ، مذہبی حضرات ہوں یا سیاسی سب حضور پرنور شہریار دکن کا کمال احترام اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ اور ریاست ابد مدت کی ہر خدمت کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔ نظر بر ان کم از کم اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ حادثہ [illegible] مسلمانوں میں معدودے چند ہی ایسے نکلیں گے جو اس تحریک میں ہمارے شریک کار نہ ہوں۔ اور ہم یقیناً اتفاق و اتحاد سے ایک اسلامی ملک کی ویسی ہی خدمت کر سکینگے جیسا وہ مستحق ہے۔

تقسیم کار کے اصول پر اس مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے متفرق طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔ اور ہر جماعت کو وہ طریقہ سپرد کیا جائیگا جسکی وہ اہل ہو۔ مثلاً انتہا پسند طبقہ جس نے ملک و قوم کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں وہ اپنے وعدہ کے

مطابق ایک زبردست احتجاجی پروگرام بنائے۔

میں نہیں کہتا کہ اس جماعت کے پیش نظر انکا لیڈروں کا پروگرام اور انکی سرفروشانہ جد و جہد ہونا چاہئے۔ لیکن اُس ناکامی سے مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے جو سکھوں کو ہوئی۔ یہ بات یقینی ہے کہ سکھوں کی محدود جماعت کو جو چند لاکھ ہی ہے جس قدر جزوی کامیابی ہوئی ہے اُس کے مقابل مسلم گروہ کو جسکی تعداد چند کروڑ ہے جو کامیابی ہوگی وہ یقیناً سوگنا زیادہ ہوگی۔ لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ اگر ایسا کوئی پروگرام بنایا جائے تو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مستعد تو رہنا چاہئے مگر اُس پر گامزن ہونے میں عجلت نہیں چاہئے۔ مجھکو یہ اندیشہ نہیں ہے کہ اگر خدانخواستہ ناکامی ہوئی تو ہمکو ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا بلکہ مجھکو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ آسان سے آسان طریقہ عمل میں لائیں جو ریاست کے لئے انفع ہو۔

یہ تو ظاہر ہے کہ انتہا پسند طبقہ ایجیٹیشن کے نتائج سے کبھی نہیں ڈرتا کہ ایجیٹیشن خود ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی انسان کا مقصد ہو سکے جنگ کے سوا جب چارہ ہی نہ ہو تو زبردست سے زبردست دشمن سے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن جہاں صلح کا امکان ہو تو کمزور سے کمزور مخالف کو بھی دعوت جنگ دینا سخت جرم ہے۔ ماسوا انکے انتہا پسندوں کے علاوہ ملک میں اور بھی دو گروہ ہیں۔ ایک معتدل۔ ایک سرکاری اعزاز یافتہ۔ اگر انتہا پسند طبقہ عجلت کیساتھ سرگرم عمل ہو گیا تو شاید ان دونوں جماعتوں کو کام کرنے کے لئے موقع نہ دیگا۔ اور ضرورت اسوقت اسکی ہے کہ جماعت معروف کار ہو سکے اور اپنے اصول کے ماتحت جد و جہد میں حصہ لے سکے۔ مجھکو اسوقت گورنمنٹ نظام کو ایرلنڈ کیطرح ممالک میں کوئی خاص پارٹی پیدا کرنا نہیں ہے اور نہ ہندوستان کو سابق کیطرح گورنمنٹ کو اپر برٹش کی تفریق میں مبتلا کرنا ہی ہے جس مقصد میں سب ہمدردی رکھتے ہیں تو اسکو حق عمل ہے۔

معتدل جماعت کا یہ کام ہونا چاہئے کہ وہ کونسلوں میں سوال اٹھا کر پہلے اُس مراسلت کو منظر پر لکھوائے جو سرکار عالی اور گورنمنٹ آف انڈیا میں ہو رہی ہے اور پھر رزولیوشن کے ذریعہ اسکی ناواجبی ہونے کو ثابت کرے۔ اور کونسل کے ذریعہ وائسرائے کو مجبور کرے کہ وہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کریں۔

سرکاری اعزاز یافتہ حضرات کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ ایک زبردست وفد اعلیٰ حضرت کے حضور میں بھیجیں
اور اپنے طریقہ کے مطابق داد خواہی کریں اور اگر گورنمنٹ آف انڈیا میں کچھ شنوائی ہو تو ایک زبردست وفد انگلستان بھی بھیجیں
اسمیں علاوہ اس کے اگر کچھ کہ مسئلہ کی اہمیت مجھ کو شکل کلام کو اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔

یہ پیشنگوئی کرنا تو بہت ہی دشوار ہے اور میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ آیا ان وفود سے اور کونسلوں کے احتجاج
سے مقصد برآری ہو جائیگی یا نہیں۔ لیکن کسی ایسے سوال کے اٹھانے کی اسوقت ضرورت نہیں جس میں تفریق جماعت
کا اندیشہ ہو۔ بالفرض اگر کامیابی ہو جائے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ اور اگر خدانخواستہ ناکامی ہو تو ہمیں امید
کرنے کی کافی وجہ ہے کہ سرکاری طبقہ اور معتدل جماعت کم از کم اس مقصد میں انتہا پسندوں کے ساتھ
شریک رہیگی۔ اور گویا ہندوستان میں حقیقی طور سے ایک پارٹی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ ہم
تو اس مخصوص معاملہ میں کامیابی یقینی ہے بلکہ آئندہ بھی ہر مقصد میں مسلمان کامیابی کے بہت ہی قریب
ہو جائنگے۔

یہ ایک بہت ہی طویل الکلام ہے جو نہایت مختصر طور پر آپ حضرات کے سامنے پیش کیا ہے۔ نیز اس
موضوع پر مزید بحث و مباحثہ رزولیوشنوں کے سلسلہ میں ہوگا۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ کانفرنس ضرور
کسی نتیجہ تک پہونچیگی۔ جس میں بہتر سے بہتر دماغ موجود ہیں۔

ایک نہایت ہی اہم بات جو اس تحریر میں شروع سے میرے خیال میں تھی اب آخر میں آپ حضرات
کے سامنے پیش کرتا ہوں وہ ایک مخلصانہ گذارش ہے جس کا مخاطب ہر طبقہ اور ہر جماعت ہے۔ یعنی خواہ
ہم وفد لیجاتے ہوں یا کونسلوں میں سرگرم مباحث ہوں یا کسی اور زبردست پروگرام کو تیار کرنے میں
مشغول ہوں۔ ہر وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے کسی فعل سے ایسا نہ ہو کہ ہز اگزالٹڈ
سرکار عالی کو مزید پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اور جملہ جو حضرات کو موقعہ ملا ہے
ہکو سرکاری نیاز مندی میں اور سرکاری مقابلہ میں ہر وقت اس نازک عہد کا خیال رہے
اور اپنے اصول سے زیادہ خدمت ریاست کے خیال کو مقدم رکھنا چاہیے۔

آخر میں میں پھر آپ حضرات کے سامنے اپنی کم حوصلگی کی معذرت کرتے ہوئے اور الطاف
کانفرنس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب۔

فقیر محمد عبد القدیر القادری غفرلہ

تجاویز آل انڈیا نظام کانفرنس

۱- مسلمانان ہند کا یہ اجتماع عظیم اعلیٰ حضرت حضور نظام عالی مقام اور ان کے اجداد کی اسلامی خدمات کا بہ دل سے اعتراف کرتا ہے اور مسلمانان ہند کی عقیدت و محبت کا یقین دلاتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ خدائے عزوجل ان کو اور ان کی سلطنت کو ہمیشہ چشم زخم حوادث سے مامون رکھے۔ آمین

۲- مسلمانان ہند کا یہ اجتماع عظیم حضور نظام کے مطالبہ برار کو حق بجانب سمجھتے ہوئے ان کی حمایت کرتا ہے اور حکومت انگلشیہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ ممدوح کی خدمات کا جو انہوں نے حکومت مذکور کی انجام دی ہیں۔ لحاظ کرتے ہوئے ان کا حق ان کو واپس دیدیں۔ اور کروڑہا مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کریں۔

۳- یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی خیرہ حالت تمام مسلمانان ہند کے باعث تشویش ہے یہ اجتماع عظیم صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ گورنمنٹ جلد از جلد اپنی دوستانہ روش کا اعلان کرے جس کے حضور پرنور اگزالٹڈ ہائی نس بالکل حقدار ہیں۔

۴- یہ اجتماع عظیم تجویز کرتا ہے کہ ایک وفد فرمانروائے کی خدمت میں جائے اور موجودہ نازک صورت حال کو ریاست دکن کے متعلق تمام مسلمانان ہند کے متفقہ نقطہ نگاہ کو فرمانروائے کی خدمت میں پیش کرے جس میں حسب ذیل حضرات سے شرکت کی درخواست کی جاتی ہے۔

سر میاں محمد شفیع صاحب۔ سر مہاراجہ محمود آباد صاحب۔ مسٹر حسن امام صاحب۔ سر عبد الرحیم صاحب۔ ڈاکٹر کچلو صاحب۔ سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی۔ حضرت شاہ نثار احمد صاحب۔ جناب سید قائم الحسن صاحب۔ ازاں جملہ نواب سید مہر شاہ صاحب۔ شیخ صادق حسن صاحب اس کے کنوینر مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان کو حق ہوگا کہ وہ اسمیں اضافہ بھی کر لیں۔

تجاویز آل انڈیا نظام کانفرنس

۱- مسلمانان ہند کا یہ اجتماع عظیم اعلیٰ حضرت حضور نظام عالی مقام اور ان کے اجداد کی اسلامی خدمات کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہے اور ان کو مسلمانان ہند کی عقیدت و محبت کا یقین دلاتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ خدائے عز و جل ان کو اور ان کی سلطنت کو ہمیشہ چشم زخم حوادث سے مامون رکھے۔ آمین

۲- مسلمانان ہند کا یہ اجتماع عظیم حضور نظام کے مطالبہ برار کو حق پر مبنی سمجھتے ہوئے ان کی حمایت کرتا ہے اور حکومت انگلشیہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ ممدوح کی خدمات کا جو انھوں نے حکومت مذکور کی انجام دی ہیں۔ لحاظ کرتے ہوئے ان کا حق ان کو واپس دے دیں۔ اور کروڑ ہا مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کریں

۳- یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی خفیہ مراسلت تمام مسلمانان ہند کے لئے باعث تشویش ہے یہ مجلس عظیم صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ گورنمنٹ جلد از جلد اپنی دستار بخشش کا اعلان کرے جس کے حضور ہز اگزالٹڈ ہائی نس بالکل مستحق ہیں۔

۴- یہ اجتماع عظیم تجویز کرتا ہے کہ ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں جائے اور موجودہ نازک صورت حال کو ریاست دکن کے متعلق تمام مسلمانان ہند کے منشاء نقطہ نگاہ کو وائسرائے کی خدمت میں پیش کرے جس میں حسب ذیل حضرات سے شرکت کی درخواست کی جاتی ہے؟

سر میاں محمد شفیع صاحب، سر مہاراجہ محمود آباد صاحب، مسٹر حسن امام صاحب، سر عبد الرحیم صاحب، ڈاکٹر [illegible] صاحب، سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، حضرت شاہ [illegible] احمد صاحب، جناب سید [illegible] حسن صاحب، آنریبل نواب سید مہر شاہ صاحب، شیخ صادق حسن صاحب اس کے کنوینر مقرر کئے جاتے ہیں۔ ان کو حق ہوگا کہ وہ اس میں اضافہ بھی کرلیں۔